کلامِ اقبال (اردو)

فرہنگ وحواشی

احمد جاوید

۱۔ کلامِ اقبال (اردو) فرہنگ وحواشی کا منصوبہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔
۲۔ حواشی میں مندرجہ ذیل امور کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔
الف:۔ اعلام اور تلمیحات: یعنی اقبال نے جن شخصیات، واقعات اور مقامات وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے یا ان کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کا ضروری تعارف۔
ب:۔ مشکلات..... یعنی ایسے مقامات جہاں خیال دقیق ہو یا الفاظ مشکل ہوں یا کوئی بنیادی تصور بیان ہوا ہو۔ ان مقامات کی تشریح، توضیح اور تفصیل۔ اس میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ عام قاری کی مشکل کو سادہ اسلوب میں حل کیا جائے اور وہ مقامات جہاں اہلِ علم الجھ سکتے ہیں یا غور وفکر پر مجبور ہو سکتے ہیں، ان پر علمی انداز سے قلم اٹھایا جائے تا کہ اس خیال اور تصور کی عظمت جسے عام سطح تک نہیں لایا جا سکتا، مجروح نہ ہو۔
ج:۔ تکنیکی اور فنی محاسن: یعنی شعر میں پائی جانے والی لفظی رعایتوں، معنوی مناسبتوں اور فنی باریکیوں کا تجزیہ۔
۳۔ فرہنگ میں کلیدی الفاظ اور اصطلاحات کو کھولا گیا ہے اور اس میں بھی اسی اصول پر عمل کیا گیا ہے جو حواشی کی شق ''ب'' میں بیان ہوا۔ ہر لفظ اور اصطلاح کے تمام معانی ایک ہی اندراج میں نہیں دیے گئے۔ ہر اندراج میں وہی معنی لکھے گئے ہیں جو اس خاص مقام پر اقبال کے پیشِ نظر تھے۔ حتمی تدوین کے بعد کسی لفظ کے تمام معنوی پہلو یکجا حالت میں سامنے آ جائیں گے۔

○

صفحات ذیل میں فرہنگ وحواشی کے چند نمونے قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

کلیاتِ اقبال (اردو)

احمد جاوید

ص کلیات۔۴۰۰

غزل:۵۷

شبانی:۱-گلّہ بانی۔۲-اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے اُس دور کی طرف جب آپ نے حضرت شعیب علیہ السّلام کی بھیڑ بکریوں کی گلہ بانی کی۔اس کے بعد اُن کے داماد بنے۔ بیوی کو لے کر مصر کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں کوہ طور پر نبوت سے سرفراز ہوئے۔۳-بھٹکی ہوئی منتشر اور بدحال قوم کی رہنمائی کے لیے کسی مرد کامل کی نگرانی میں ریاضت اور تربیت کے مرحلے طے کرنا۔۴-فقر، سادگی و درویشی۔

نیز دیکھیے:

''اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے''

ص کلیات۔۴۰۰

تمہید کلیم اللّٰہی: ۱-کلیم اللہ یعنی اللہ سے کلام کرنے والا بننے کی تیاری/آغاز۔۲-اللہ سے تعلق جوڑ کر براہ راست ہدایت لینے اور اس ہدایت کو اپنی قوم میں پھیلانے کی تمہید۔۳-احکام الٰہیہ کو اپنی ذات اور اپنی قوم پر نافذ کرنے کی صلاحیت کا آغاز۔

ص کلیات۔۴۰۰

لذّتِ نغمہ:۱-گیت گانے کی لذت، چہچہانے کا مزا۔۲-دل کی ترنگ کو زبان پر لانے کی کیفیت۔ ۳-حُسن اور خیر کے ترانے بلند کرنے کی لگن۔۴-اظہارِ شوق میں سرشار رہنے کی حالت۔۵-شاعری کے ذریعے جمال کی صورت گری اور اُس سے حاصل ہونے والی راحت اور آسودگی۔

ص کلیات۔۴۰۰

مُرغِ خوش الحاں: ۱-خوش آواز پرندہ۔۲-خوش نوا شاعر۔۳-حُسن، محبت اور خیر کے گیت گانے والا۔

ص کلیات۔۴۰۰

اس باغ میں: یعنی اس دُنیا میں:۱-جو خیر، محبت اور حُسن سے خالی ہوتی جارہی ہے۔۲-جو احوالِ دل کے ذرا سے اظہار کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔۳-جو دل کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے۔۴-جس میں آدمی اپنے اندر کی روشنی کو پوری طرح منعکس نہیں کرسکتا۔۵-جو ایک ایسے باغ کی طرح ہے جس پر وہ بہار نہیں آئی جو قلب و روح کو شاداب رکھتی ہے۔ یہاں کا رنگ روپ دھوکا ہے اور فضا ایسی کہ دم گھٹنے لگے۔

ص کلیات۔۴۰۰

.....کرتا ہے نفس کوتاہی: ۱-دم گھٹتا ہے، سانس رُکتا ہے۔۲-آواز نہیں نکلتی۔۳-وقت تنگ ہے۔

ص کلیات۔۴۰۰

سرمستی و حیرت: یہاں سرمستی و حیرت کے کئی معنی ہیں مثلاً:۱-سرمستی، وہ حال ہے جو اپنے مقصود اور منتہا تک رسائی کے مراحل طے کرتے ہوئے، طاری رہتا ہے، جبکہ 'حیرت' اس سفر کے اختتام پر میسر آتی ہے۔یعنی ایک کا تعلق راستے سے ہے اور دوسری کا منزل سے۔۲-'سرمستی' مقصود کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور 'حیرت' مشاہدے سے۔۳-'سرمستی' حس کی انتہا ہے اور 'حیرت' عقل کی۔۴-تصوف کی اصطلاح میں 'سرمستی' حبّ عشقی کا اور 'حیرت' حبّ عقلی کا انتہائی حال ہے۔ اقبال نے اسی سرمستی و حیرت کو تمام آگاہی کہا ہے۔۵-'سرمستی' پانے کی کیفیت ہے، اور 'حیرت' جو پایا ہے اُسے سمجھ سکنے کی۔۶-غفلت اور نادانی جو ''سراپا تاریک'' ہے۔۷-محسوس اور معقول میں منہمک ہوکر حقیقت سے بےخبر رہ جانا۔ نیز دیکھئے:

''ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک
ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی''

ص کلیات۔۴۰۱

غزل:۵۹

سریر: تختِ شاہی

علم کا مقصود ہے پاکیِ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

علم کی بناوٹ ذہنی واستدلالی ہے اور فقر کی روحانی واخلاقی۔ علم کا مطالبہ بس اتنا ہے کہ عقل، فہم اور استدلال میں غلطی نہ کرے، جبکہ فقر کے پیشِ نظر یہ ہے کہ سینہ روشن اور نفس پاک ہو جائے۔
نیز دیکھیے: 'پاکیِ عقل وخرد'، 'عفتِ قلب ونگاہ'۔

ص کلیات۔ ۴۰۱

پاکیِ عقل وخرد: ۱- عقل اور ذہن کی جلا اور صفائی۔ ۲- ذہن کی لطافت جو ادراکِ حقائق کے لیے ضروری ہے۔ ۳- عقل کا حواس کے غلبے سے نکل کر حقیقت کو پانے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

ص کلیات۔ ۴۰۱

عفّتِ قلب و نگاہ: ۱- دل اور نگاہ کی پاکیزگی۔ ۲- تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن، شر سے حفاظت اور خیر سے وابستگی، رذائل کا خاتمہ اور فضائل کا حصول۔ ۳- قلب کی عفت یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ کی طرف سے غافل نہ ہو، اور نگاہ کی عفت یہ ہے کہ شر کے مظاہر سے بچی رہے تاکہ گناہ کا داعیہ اُبھرنے نہ پائے —— گویا 'عفّتِ قلب ونگاہ' کا مطلب یہ ہوا کہ غفلت اور معصیت کے تمام راستے بند کر دیے جائیں۔

ص کلیات۔ ۴۰۱

علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویاے راہ، فقر ہے داناے راہ

اس شعر کو سمجھنے کے لیے کچھ مراحل سے گذرنا ضروری ہے:
۱- علم سے مراد ہے عقلی علم، جس کی روح 'ڈھونڈنا' ہے۔ یعنی عقل کسی بھی مرحلے پر تلاش و جستجو سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ ۲- عقل کی خوے جستجو کا تقاضا ہے کہ وہ قطعیت کا اثبات نہ کرے۔ اس لیے عقل سے حاصل ہونے والا علم قطعی نہیں ہو سکتا اور اس سے یقین کا میسر آنا محال ہے۔ ۳- حصولِ یقین، عقل کی سب سے بڑی تمنا ہے جس کی تکمیل میں واحد رکاوٹ وہ خود ہے۔ ۴- عقل، مذہبی ہو تو کلام اللہ کے محکمات و متشابہات کی علت وحقیقت دریافت کرنے کے درپے ہو جاتی ہے اور اس طرح معلوم کو ایک واحد الاصل کُل بنانے کی سعی کرتی ہے جو اس کا یعنی عقل کا ذاتی اقتضا ہے۔ ۵- محکم یعنی حکم کی علت دریافت کرنے کا عمل فقہ ہے جس کا مدار قیاس پر ہے اور متشابہ یعنی عقدے کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش حکمت ہے، یعنی کلام اور مابعد الطبعی فلسفہ۔ چونکہ علّتِ حکم اور حقیقتِ ایمان کو قطعیت سے متعین نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ان تک پہنچنے کی ہر کوشش نارسائی کے ادراک سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی

ہے۔ فقیہ احکام کی علّت کو پانے کا دعویٰ کر سکتا ہے نہ حکیم، ایمانیات کی حقیقت کو۔ ۶- 'حکیم' کو فلسفی کے معنی میں لیا جائے تو یہ عقل کے غیر مذہبی کردار کا مظہر ہوگا۔ ہستی کی حقیقت کو عقلِ محض پر انحصار کر کے جاننے کی مسلسل کوشش جو کہیں ختم نہیں ہوتی، فلسفے کی اساس ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس شعر میں علم سے کیا مراد ہے اور اسے فقیہ و حکیم اور جویاے راہ کیوں کہا گیا ہے؟ اب فقر کے مسیح و کلیم اور داناے راہ ہونے کی وضاحت درکار ہے تاکہ علم و فقر کے موازنے کا وہ اصول سمجھ میں آ جائے جو اس شعر میں بلکہ پوری غزل میں کارفرما ہے:

۱- فقر، تکمیل بندگی کا وہ نقطہ ہے جس میں محبت، خشیت اور معرفت اپنے انتہائی کمال کے ساتھ ایک ہو گئے ہیں۔ یہاں عشق اور تقویٰ ہم معنی ہیں۔ [دیکھیے 'عفت قلب و نگاہ'] ۔ ۲- فقر، عقل کے برعکس، حق اور حقائق کا متلاشی نہیں بلکہ اُن کا مظہر ہے۔ ۳- عقل، حق تک پہنچنے کے لیے جس راہ کی تلاش میں سرگرداں ہے فقر نہ صرف یہ کہ اُس راہ یعنی صراط مستقیم سے آگاہ ہے بلکہ اُسے دوسروں کے لیے بھی کھول دیتا ہے۔ ۴- فقر کو مسیح و کلیم کہنے کی کئی وجہیں ہیں۔ مثلاً:

ا- فقر، حق پر یقین کا نام ہے۔ حق کا مکمل ترین اظہار خود اس کا کلام ہے۔ حق پر یقین کا آخری درجہ یہ ہے کہ بندہ، کلام حق کا براہ راست مخاطب اور مظہر بن جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں، یعنی حق سے مخاطبت کا شرف رکھتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں، یعنی کلام حق کا مظہر ہیں۔

ب۔ فقر، کمالِ بندگی ہے۔ کمالِ بندگی کے دو پہلو ہیں —— ایک تو یہ کہ بندہ اللہ کی الوہیت کی نشانی بن جاے، اور دوسرا یہ کہ بندگی کے قوانین و آداب کا عملی نمونہ اور معلم بن جائے۔ پہلے وصف کے نمایندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور دوسرے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں روحانیت کا کمال ہے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہاں قانون و شریعت کا۔ صوفیوں کی اصطلاح میں عیسیٰ علیہ السلام مجسم ولایت تھے اور موسیٰ علیہ السلام سراپا نبوت۔ ایک معجزے دکھاتے تھے اور دوسرے سے دکھائے جاتے تھے۔

ج۔ فقر، معرفت ہے۔ معرفت کے دو نتیجے ہیں: محبت اور اطاعت۔ عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں محبت کا غلبہ ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کے ہاں اطاعت کا۔

د۔ فقر، محبت ہے۔ محبت کا تقاضا ہے کہ ماسوی اللہ کو دل میں جگہ نہ دی جائے۔ اس تقاضے کی تکمیل کے دو طریقے ہیں: ترکِ دُنیا ماسوا سے دور ہو جانا اور تسخیرِ دُنیا یعنی ماسوا پر غالب آ جانا۔

پہلا طریقہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے اور دوسرا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔
۵- فقر اور علم دونوں کا مقصود حصولِ یقین ہے۔ فقر اس مقصود تک پہنچ گیا جبکہ علم محروم رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقر کا مدار وحی پر ہے اور علم کا عقل پر۔ اس لیے فقر کے لیے یقین حضور اور حال ہے اور علم کے لیے حصول اور استدلال، فقر تصدیق ہے اور علم تصور —— فقر کا ہدف 'ماننا' ہے، قلب سے، جبکہ علم کا ہدف 'جاننا' ہے، ذہن سے۔ ۶- فقر اور علم کے موازنے کو مسیح و کلیم اور فقیہ و حکیم کا موازنہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ فقیہ و کلیم میں شریعت، اور مسیح و حکیم میں حقیقت مشترک ہے۔

ص کلیات۔۴۰۲

غزل: ۶۱

شعور و ہوش و خرد: یہ تینوں 'انا' کی تعمیر اور تحفظ کرتے ہیں —— شعور 'مَیں' کو 'وہ' پر غالب رکھتا ہے، ہوش اس کو اپنے مقصود پر نثار نہیں ہونے دیتا اور 'خرد' اسے کسی ایسے امتحان میں پڑنے سے روکتی ہے جس میں اس کے تصور کردہ نقصان کا اندیشہ ہو۔

ص کلیات۔۴۰۲

صاحب کشاف: تفسیر الکشاف عن حقائق التنزیل کے مصنف یعنی جار اللہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری (۲۷/ رجب ۴۶۷-۵۳۸/ ۸/ مارچ ۱۰۷۵-۱۱۴۴ء)

ص کلیات۔۴۰۲

سرور و سوز: ۱- مستی اور حرارت۔ ۲- شراب کی تاثیر۔ ۳- کسی خاص تہذیب کی علمی و فنی روایت کے نتائج اور فوائد۔ ۴- انسان اور کائنات کے بارے میں کسی تہذیب کے بنیادی تصورات کا مجموعی حاصل۔ ۵- انسان کے انتہائی احوال و کیفیات جن کی حیثیت ان کے محرک، موضوع اور مقصود سے متعین ہوتی ہے۔ یعنی یہ حال کسی چیز سے اور کسی چیز کے لیے پیدا ہوتا ہے، اگر وہ چیز دائمی اور روحانی ہے تو یہ بھی دائمی اور روحانی ہوگا ورنہ وقتی اور نفسی جو جسم، ذہن اور دُنیا کی ترکیب سے تشکیل پاتا ہے۔

ص کلیات۔۴۰۲

مئے فرنگ: ۱- مغرب کی شراب۔ ۲- مغربی علوم، مغرب کی علمی روایت۔ ۳- عقل پرستی۔ ۴- انسان اور کائنات کی حقیقت کا وہ تصور جو مغربی فلسفے، سائنس اور تہذیب کی بنیاد ہے۔ ۵- مغرب کے دُنیاوی علوم و فنون جنھیں رد نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا کی سطح پر اُن کا صحیح اور مفید ہونا ہر

طرح سے ثابت ہے۔

ص کلیات۔۴۰۲

تہ جُرعہ: ۱- شراب کی تلچھٹ جو عام طور پر گدلی ہوتی ہے۔۲- بالکل نچلے درجے کے علوم، کسی علمی روایت کا ادنیٰ اور معمولی حصہ۔

ص کلیات۔۴۰۵

رباعیات

نامحرمانہ: ۱- غیروں/اجنبیوں/ناواقفوں/ بیگانوں کا سا۔۲- یہ لفظ 'حرم' کی مناسبت سے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں محرم سے مراد ہے: حرم سے باہر والا/جسے حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہو/حرم سے روحانی نسبت نہ رکھنے والا/اسلام سے دور/دین کا مخالف/اسلام کی روح سے بے خبر وغیرہ۔

ص کلیات۔۴۰۵

ظلامِ بحر: سمندر کی گہرائی میں چھائے ہوئے اندھیرے۔ [ظلام = 'ظلمت' کی جمع، اندھیرے + بحر]

ص کلیات۔۴۰۵

یقیں: کسی چیز کے مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہونے والی کیفیت جو اُس چیز کے اثبات کی مضبوط ترین بنیاد اور محکم ترین دلیل ہے۔ یقین کے تین ذرائع ہیں: خبر، مشاہدہ اور تجربہ۔ ایمانیات میں مشاہدہ اور تجربہ صرف نبی کو ہوتا ہے، امتیوں کے لیے خبر ہی ہے جس سے وابستگی درجۂ کمال پر پہنچ کر وہ حال پیدا کرتی ہے جس کے لیے مشاہدے اور تجربے کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہی کمالِ ایمان جو خبر کے تقاضوں کی تکمیل کرنے سے میسر آتا ہے اور اس کا موضوع اسی طرح قابلِ وثوق اور لائقِ تصدیق ہوتا ہے جس طرح کہ سامنے کی چیزیں۔ اس سطح یقین کا ایک جامع و مانع بیان ابن عربی کے ہاں ملتا ہے: ''الحق محسوس''، حق محسوس ہے یعنی ہر تجربہ اور مشاہدہ اسی پر دلالت کرتا ہے اور اسی پر تمام ہوتا ہے۔ کوئی چیز محسوس اور معلوم ہو ہی نہیں سکتی جب تک وہ حق کے احساس اور معرفت کا وسیلہ نہ بنے۔

ص کلیات۔۴۰۶

آزاد مکاں: زمان و مکاں سے آزاد کائنات کے دائرے سے باہر، غیر محدود۔

ص کلیات۔۴۰۶

مکانی: ۱- 'مکان' سے منسوب، وجودِ محدود۔۲- جس کا وجود جسمانی اور مادّی ہو۔۳- فانی،

محدود اور مخلوق ہستی۔ کیونکہ جو مکانی ہو گا ، وہ زمانی بھی لازماً ہوگا۔[نیز دیکھیے :زمان و مکاں'، 'مکاں' کے اندراجات]

ص کلیات۔ ۴۰۶

مثلِ خلیل آتش نشینی: ۱۔حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح آگ میں براجمان ہو جانا۔اس واقعے کے لیے دیکھیے : سورۂ انبیاء ۲۔حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح ایمان کومحسوسات پر اور غیب کو شہود پر غالب جاننا اور اس یقین کو اپنے عمل سے ثابت کرنا۔۳۔حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا سا ایمان، بندگی، توکل، تسلیم ورضا اور حق کی گواہی ۔

ص کلیات۔ ۴۰۶

اللہ مستی: ۱۔ اللہ میں مست رہنا۔۲۔ اللہ کی محبت اور معرفت میں ڈوبے رہنا۔۳۔ اللہ کے سوا کسی طرف متوجہ نہ ہونا، اللہ کی یاد میں سب کچھ بھول جانا۔۴۔ اللہ کے لیے خود کو مٹا کر اسے اپنی پہچان بنا لینا، اُن لوگوں کی طرح بن جانا جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔۵۔ اللہ کے انتہائی قرب کی کیفیت۔۶۔ ایمان کا یقین بن جانا۔

ص کلیات۔ ۴۰۶

خود گُزینی: ۱۔ اپنے آپ کو چن لینا، خود کو پا لینا۔۲۔ اپنی ذات کو کسی اور میں ضم نہ ہونے دینا، خودی کو محفوظ اور برقرار رکھنا۔۳۔ اپنی ذات کے جوہر یعنی اللہ کی بندگی اور ماسوی اللہ پر غلبے کو دریافت کرکے اپنی واحد پہچان بنا لینا۔۴۔ شرف انسانی کی معرفت اور اس کا عملی اثبات اور اظہار۔

ص کلیات۔ ۴۰۷

ہر اک ذرّے میں شاید مکیں دل
اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیرِ دوش و فردا ہے ولیکن
غلامِ گردشِ درواں نہیں دل

۱۔ یہاں دل ، روح، عشق اور حقیقتِ انسانی یعنی خودی کے معنی میں ہے۔۲۔وجود کے دو اصول ہیں: زمان و مکاں ۔ پہلے دو مصرعوں میں دل اور مکاں کا تقابل کرکے اس کی مکانی یا کائناتی جہت بیان کی گئی ہے کہ دل وجود کی اس شرط یعنی مکانیت کو خود مکان سے بڑھ کر پورا کرتا ہے۔ وہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں سمایا ہوا ہے اور اس سے بلند اور ممتاز بھی ہے:

اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل

یعنی دل، وجود کی اُس مکانی وسعت کا بھی احاطہ کرتا ہے جو کائنات یا آفاق کے حدودِ ہستی میں نہیں سماتی۔۳- آخری دو مصرعوں میں دل کو زمانے کے مقابل رکھا گیا ہے کہ وہ زمانی تو ہے مگر زمانیت کے لوازم یعنی تغیر اور فنا سے آزاد ہے۔ اُس کا زمانی ہونا اس وجودی مماثلت کی وجہ سے ہے جو وہ کائنات کے ساتھ رکھتا ہے، لیکن چونکہ یہ مماثلت کلی نہیں بلکہ جزوی ہے اور دل کے بعض احوال وجودِ کائنات میں نہیں پائے جاتے لہٰذا اس پر زمانہ اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا جس طرح دیگر موجودات پر ہوتا ہے۔۴۔ یوسف سلیم چشتی نے اسیر اور غلام کا فرق بہت اچھی طرح واضح کیا ہے: ''اسیر وہ ہے جو بذاتِ خود تو آزاد ہو لیکن کسی وجہ سے گرفتار ہو گیا ہو، غلام وہ ہے جو اپنی آزادی سے محروم ہو چکا ہو اور غلامی اس کی زندگی بن گئی ہو۔'' (شرح بالِ جبریل، ص ۴۶۶)۔ نیز دیکھیے: *Reconstruction* کا چوتھا خطبہ:

The Human Ego, his Freedom and Immortality

ص کلیات۔ ۴۰۷

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے

یعنی :۱- عرب اور غیر عرب اسلام کی بنیاد پر ایک ہیں۔۲- عرب کے احساس کی حرارت، سادگی اور گہرائی، اور ایرانی کے تخیل کی چمک دمک، رنگینی اور بلندی کو اسلام نے ایک کر دیا ہے۔۳- اسلام نے عقل کو قلب میں سمو دیا ہے اور احساس و تخیل کا فرق مٹا دیا ہے۔۴- انسانی طبائع کے اختلاف کو دینِ محمدی نے ایک دوسرے کی معاون قوت بنا دیا ہے۔

عرب کے سوز کے بنیادی اجزاء یہ ہیں: حق، خیر، قلب، احساس، سادگی، اطاعت، خشیت، محبت۔

سازِ عجم کے بنیادی اجزاء یہ ہیں: جمال، تخیل، رنگا رنگی، معرفت، تمدن۔

ص کلیات۔ ۴۰۷

کوئی دیکھے تو میری نَے نوازی
نفس ہندی، مقامِ نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

۱- اس رباعی میں اقبال نے انتہائی اختصار کے ساتھ اپنی پوری زندگی بیان کر دی ہے۔ یعنی میں

ہندوستان میں پیدا ہوا، جو پیغام دیتا رہا وہ عربی تھا۔ یورپی علوم حاصل کرنے کے باعث میری نظر میں یورپ کا اثر کم وبیش باقی رہا اور طبیعت غنا اور بے نیازی کے اعتبار سے شاہانہ تھی لیکن قسمت ایسی پائی کہ کسب معاش کے لیے جو کچھ کرتا رہا وہ اگرچہ کتنا ہی خوددارانہ تھا تاہم اس میں دوسروں سے کامل بے نیازی میسر نہ آ سکی، لہٰذا اسے ایازی ہی سمجھنا چاہیے۔ (مطالب، ص ۱۰۵)

(- اقبال نے ایک ایک مصرعے میں اپنی شاعری، فکر اور شخصیت کو کھولا ہے —— میری شاعری گویا بانسری بجانے کا عمل ہے۔ پھونک ہندی ہے جو عربی نغمے میں ڈھل کر نکلتی ہے۔ یعنی میری تخلیقی قوت ہندوستانی رنگ رکھتی ہے لیکن اس کا اظہار عربی آہنگ میں ہوتا ہے۔ 'نفس' ان لفظوں میں سے ہے جو اقبال کے ہاں بار بار آتے ہیں اور کبھی کسی ایک معنی تک محدود نہیں ہوتے۔ اس کے کئی معنی ہیں جن میں مرکزی اور فوری مفہوم 'سانس' کا ہے جو 'نفس' کا اصلی مطلب ہے، باقی معانی اس مطلب سے پھوٹتے ہیں اور اسی کے حوالے سے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں 'نفس' جس معنوی کثرت اور تدریج کا حامل ہے اس کا ایک خاکا بنایا جائے تو کچھ یوں بنے گا:

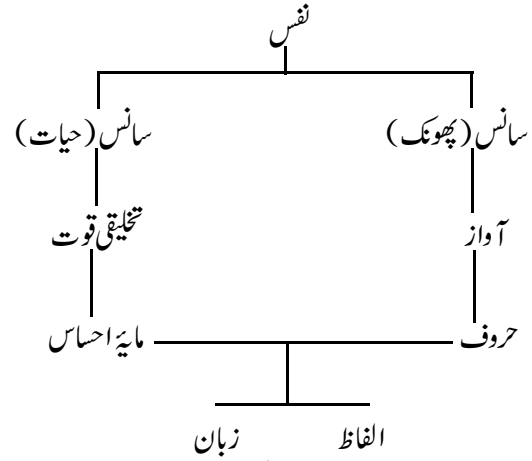

گویا نفس کی معنوی جہات اپنی اپنی اندرونی تدریج کے ساتھ ایک مشترک نقطے پر تمام ہوتی ہیں۔ لفظ اور زبان ایک خفیف سے فرق کے باوجود ہم معنی ہیں۔ وہ فرق یہ ہے کہ لفظ اور زبان دونوں کی حقیقت ایک ہے: معنی —— تاہم لفظ کو معنی سے براہ راست نسبت ہے جبکہ زبان کو یہ نسبت لفظ کے واسطے سے میسر آتی ہے۔ اس توضیح کے مطابق 'نفس ہندی' کا مطلب ہوگا: 'لفظ اور زبان میں ہندوستانی'۔ یہاں اس مطلب کے حصول کا پورا سفر بھی ذہن میں رکھنا چاہیے ورنہ یہ ناقص رہ جائے گا۔

'نفس'، بمعنی لفظ کی مناسبت سے 'مقام' کا مطلب متعین کرنا آسان ہو گیا ہے۔ آواز کی لہر میں اُتار چڑھاؤ پیدا کر کے بعض صوتی تشکیلات وجود میں آتی ہیں جو مختلف معانی، تاثرات اور احساسات پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر تشکیل ایک مقام ہے یعنی وہ بنیاد جس پر نغمہ اپنی انفرادی اور مخصوص حیثیت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں 'مقام' سر اور آہنگ ہے، جو کسی خاص معنی و کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہاں 'مقام' کو معنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ 'نفس'، قوتِ اظہار ہے اور 'مقام' روحِ اظہار۔ 'نغمۂ نَے' ان دونوں کا مرکب ہے یعنی اقبال کی شاعری میں لفظ تو ہندوستانی ہے مگر معنی، عربی۔ یا بالفاظ دیگر، اس کی زبان تو غیر قرآنی ہے لیکن پیغام سراسر قرآنی۔

ب- تیسرے مصرعے میں اقبال نے اپنی فکری ماہیت بیان کی ہے کہ میرا چیزوں کو دیکھنے کا انداز مغربی ہے۔ یعنی میرا فکری سانچا مغربی علوم کے زیرِ اثر تیار ہوا ہے لہٰذا نہ چاہنے کے باجود دینی اور مابعد الطبیعی حقائق کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں جو میں نے مغرب کے فلسفے، سائنس، نفسیات وغیرہ سے اخذ کیا ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام اپنے ایک خط میں اقبال نے یہی بات لکھی ہے: ''...... میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گذری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائقِ اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔'' (کلیات مکاتیب اقبال، ج ۲، ص ۸۹۹)

اقبال نے یہ بات خود کو جس طرح نشانۂ تحقیر و ملامت بنا کر کی ہے، اس کی مثال بڑے لوگوں ہی میں مل سکتی ہے۔ ہماری نظر میں فکرِ اقبال نتائج کے اعتبار سے دینی اور استدلال کے لحاظ سے جدید ہے اور یہ اجتماع کسی بڑے ذہن ہی میں ہوسکتا ہے۔

ج- طبیعت غزنوی، قسمت ایازی، یہ علامہ کی شخصیت کے ایک گوشے کا بیان ہے جس کی مولانا مہر نے اچھی شرح کی ہے۔ اس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ دیکھیں: شق ا۔

☆

۳- اس رباعی کے فنی اور معنوی محاسن۔ ۱:۳: نَے نوازی، بمعنی 'بانسری بجانا'، 'نفس' بمعنی 'بانسری بجانے والے کا سانس' اور مقام نغمہ بمعنی 'بانسری کے سوراخ' میں ظاہری مناسبت ہے۔ ۲:۳: نَے نوازی' بمعنی شاعری، 'نفس' بمعنی 'لفظ' اور مقامِ نغمہ' بمعنی 'معنی و کیفیت' میں داخلی مناسبت ہے۔ ۳:۳: نَے نوازی، بمعنی 'شاعری'، 'نفس'، بمعنی تخلیقی رَو اور 'مقام نغمہ' بمعنی تخلیقی رو کا سرچشمہ' ایک ہی کل کے اجزاء ہیں۔ ۴:۳: 'نے نوازی' بمعنی 'فنِ شعر'، 'نفس' بمعنی 'فنی ریاضت' اور 'مقامِ نغمہ' بمعنی مقصدِ فن' سے بھی ایسے معنی نکلتے ہیں جو اقبال کی شاعری سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ۴:۳: 'نَے نوازی' سے رومی کا تصور بھی اُبھرتا ہے یعنی اصل نَے نواز تو

رومی تھے، میں تو اُن کی تان میں تان ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ مطلب، کوئی دیکھے تو، کے استہزائیہ انداز سے نکلتا ہے۔۵:۳: 'نفس ہندی': 'مقام نغمہ تازی'، اور 'انداز افرنگ' نفس، روح اور عقل کے باہمی تضادات ہیں جو ایک شخصیت میں جمع ہو گئے ہیں۔ ۶:۳: 'نَے نوازی' اور 'ایازی' کا تضاد واضح ہے۔ ۷:۳: اصل تضاد 'نفس' اور 'مقام' میں ہے۔ 'نفس' یعنی سانس دلی حرکت اور فنا ہے اور یہ سفر، طبیعت، جسم، نسل اور وطن کا مظہر ہے۔ جبکہ 'مقام' کا اصول استقلال اور دوام ہے اور یہ منزل، مقصد، روحانیت، قلب، وحدت اور آفاقیت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں اپنے ہر جزو میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

ص کلیات۔ ۴۰۸

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

یہاں دو باتیں سمجھنی ضروری ہیں: ۱- خدائی کا لفظ خدا کی صفت کے طور پر نہیں بلکہ کائنات یا زیادہ صحیح لفظوں میں عالم خلق اور عالم امر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عالم خلق = زمین و آسمان + عالم امر = کرسی وعرش۔ ۲- ان دو مصرعوں میں 'خودی' کی الوہی اور انسانی دونوں جہتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ 'کرسی وعرش' الوہی خودی کی اور 'زمین و آسمان' انسانی خودی کی زد میں ہیں۔

نیز دیکھیے:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

ص کلیات۔ ۴۰۸

مصطفائی: ۱- محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف مبارکہ۔ ۲- اللہ کی طرف سے چُن لیے جانے کی قابلیت، محبوب الٰہی ہونے کا وصف۔ ۳- خلافت الٰہیہ، اللہ کی نیابت کا مرتبہ۔ ۴- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت، اتباع سنت جس کی بدولت مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی وارث اور مظہر بن جاتا ہے۔

نیز دیکھیے:

خودی کو جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

ص کلیات۔ ۴۰۸

صید زبوں: گرا پڑا شکار، معمولی شکار۔

ص کلیات۔ ۴۰۸

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

۱- محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خودی کا ظہور اپنے منتہا کو پہنچا اور یہ خودی وہی ہے جس کی حقیقت خدا ہے یعنی خودی کی حقیقت، اللہ ہے اور مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ۲- خودی کی جلوتوں کا مطلب ہے: عالم موجودات جس میں ہر شے خودی کا ایک ناقص یا کامل مظہر ہے۔ 'مصطفائی' یعنی چُن لیے جانے کا وصف۔ اس سے مراد ہے خودی کے مظہر اکمل کی حیثیت سے منتخب ہونے کا شرف جو فقط محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے۔ ۳- خودی کی اصل وحدت ہے۔ یہ وحدت، کثرت سے ماورا اور ذاتی ہو تو خودی الوہی ہے اور کثرت کے درمیان اور وصفی ہو تو انسانی۔ اس رباعی میں خودی کی خلوتوں سے اس کی وحدت کے الوہی مراتب مراد ہیں جو ذاتی ہیں اور ماورائے کثرت جلوتوں سے اس کے انسانی مدارج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں اس کی وحدت، اشتراک اور کثرت کو قبول تو کرتی ہے مگر اپنے تمام اوصاف و کمالات کے ساتھ ایک ہی وجود یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدیم النظیر ذات میں ہمیشہ کے لیے مجسم ہو گئی ہے۔ (دیکھیں اس اندراج کی شق ۲)۔ نیز دیکھیے: 'خودی' (تمام اندراجات)، 'مصطفائی'۔

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

ص کلیات۔ ۴۱۲

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت ملنے سے پہلے غار حرا میں کئی کئی دن خلوت نشین رہا کرتے تھے، یہاں تک کہ پہلی وحی آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہائی کا وہ معمول ترک فرما دیا جو تلاشِ حق کی خاطر اختیار کیا تھا۔ اس مصرعے میں اُسی دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دراصل اسلام کا پہلا مرحلہ تھا۔ ۲- باہر کی دُنیا میں حق کو پانے کا راستہ بند دیکھ کر اُسے بالکل تنہا اور یکسو ہو کر اپنے اندر ڈھونڈنے کا عمل۔ ۳- عشق کا پہلا مرحلہ مراقبۂ محبوب

ہے جو تنہائی میں ہی ممکن ہے۔۴-عبد و معبود کے تعلق میں معبود کی شانِ تنزیہ کا غلبہ بندے پر۔ ۵- اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ انفس میں۔

ص کلیات۔۴۱۲

کبھی سوز و سرور و انجمن عشق

عشق، مقصودِ حقیقی سے شدید تعلق اور اس تک رسائی کا نام ہے جس میں وہ دوسروں کو بھی شریک کرتا ہے۔۲- عاشق ، بندہ ہے اور اللہ، محبوب —— اس تعلق میں اللہ کی شانِ جلال کا احساس غالب ہو تو بندے کی بنیادی کیفیت، سوز ہوگی، اور اللہ کی شانِ جمال کا احساس غالب ہو تو بندے کا مرکزی حال 'سرور' ہوگا۔ جب یہ دونوں احوال اپنے کمال کو پہنچ کر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو ان سے وابستہ داخلیت اور تنہائی کا رنگ بدل جاتا ہے اور اللہ کی محبت اس عاشق کامل کے ذریعے اپنے تمام احوال سمیت دوسروں میں بھی منتقل ہونے لگتی ہے—— یہ 'انجمن' ہے۔۳-اس مصرعے میں عشق کے تین درجے بیان ہوئے ہیں: طلب (سوز)، حصول (سرور) اور حضور (انجمن)۔ ۴-عبد و معبود کے تعلق میں معبود کی شانِ تشبیہ کا غلبہ بندے پر۔ ۵- اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ انفس میں بھی اور آفاق میں بھی۔۶- دعوتِ دین پوری گہرائی اور پھیلاؤ کے ساتھ۔

ص کلیات۔۴۱۲

کبھی سرمایۂ محراب و منبر

بندے کا اللہ سے تعلق دو بنیادوں پر استوار ہے: عبادت اور اطاعت۔ عبادت ، دین کی حقیقت ہے جس کا اظہار اطاعت کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ باطن ہے اور وہ ظاہر۔ 'محراب' عبادت کا استعارہ ہے جس میں امامت بھی شامل ہے اور منبر اطاعت کا استعارہ ہے جس میں خلافت بھی شامل ہے۔ یعنی دین کا ظاہر و باطن اور حقیقت و غایت عشق پر قائم ہے بلکہ عشق ہی ہے۔۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی دو جہتیں : اللہ سے تعلق (محراب) اور مخلوق سے تعلق (منبر)۔۳-مسلمان کے باطن یعنی بندگی اور ظاہر یعنی پیغمبر علیہ السلام کی نیابت کی اساس عشق ہے۔۴-عشق ہی سے مسلمان بندہ بھی ہے اور حاکم بھی۔

ص کلیات۔۴۱۲

کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

عشق روحِ جہاد ہے جو شیر خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کی شکل میں مجسم ہوگئی۔۲-عشق حق کی شانِ جلال ہے جس کا مظہر سیدنا علیؓ ہیں۔

ص کلیات ۔۴۱۳

دم عارف نسیم صبحدم ہے
اس سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

بنیادی خیال یہ ہے کہ حصولِ کمال کے لیے کسی مردِ کامل کی صحبت اور رہنمائی شرط ہے۔
نیز دیکھیے: 'دمِ عارف'، 'نسیمِ صبحدم'، 'ریشۂ معنی'، 'کوئی شعیب'، 'شبانی'، 'کلیمی'۔

ص کلیات ۔۴۱۳

دمِ عارف: ۱- اللہ کی معرفت رکھنے والے کا روحانی فیض/کلام۔۲- اللہ کی معرفت اور نفس کی پہچان رکھنے والے مردِ کامل کا وہ عمل جس کے ذریعے سے وہ اپنی باطنی حالت کو اُس شخص میں منتقل کرتا ہے جو کمال کی سچی طلب اور ضروری استعداد رکھتا ہو۔۳- صاحبِ معرفت کی توجہ، تصرف اور تربیت۔۴- خدا رسیدہ بزرگ کی ذات سے پھیلنے والی تاثیر۔

ص کلیات ۔۴۱۳

نسیمِ صبحدم: ۱- صبح کی ٹھنڈی ہوا جسے کھا کر پھول کھل اُٹھتے ہیں اور سبزے میں جان پڑ جاتی ہے۔۲- بہار کا پیغام۔۳- غیبی فیض جس سے دل زندہ اور روح شاداب ہو جاتی ہے۔۴- زندگی، سیرابی اور نشو ونما کا سرچشمہ۔ ۵- روح کی پرورش کا سامان۔ ۶- ہدایت جس سے مردہ دل جی اُٹھتے ہیں۔۷- قربِ حق کا جھونکا۔ ۸- فیضانِ الٰہی جو روح، نفس اور عقل میں معرفت کا حال پیدا کر دیتا ہے۔۹- حق کو محسوس کروا دینے والا مرشد، معلم اور مربی۔

ص کلیات ۔۴۱۳

کوئی شعیب: یعنی کوئی خدا رسیدہ مرشد جو فطرت کی تہ تک رسائی رکھتا ہو۔

ص کلیات ۔۴۱۳

ریشۂ معنی: یہاں 'ریشہ' رگ حیات کے معنی میں ہے، یعنی وہ رگ جس پر زندگی کا دارومدار ہوتا ہے، اور اسی سے چیزیں نشو ونما حاصل کرتی ہیں۔ 'معنی' سے مراد ہے:
۱- انسانی فطرت جو حق کی امین اور حقیقتِ بندگی کی حامل ہے۔۲- انسان کا باطن جو فطرت، عقل، محبت اور ارادے کی ہم آہنگی سے تشکیل پاتا ہے۔۳- حقیقت کا ورائے ذہن حصول۔

ص کلیات۔۴۱۳

کلیمی: ۱- اللہ سے ہم کلامی کا مرتبہ جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو حاصل تھا۔۲- معرفت کا آخری درجہ، بندگی کا منتہا۔

ص کلیات۔۴۱۳

شبانی: ۱- گلّہ بانی، چوپانی۔۲- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کئی برس تک حضرت شعیب علیہ السلام کے ریوڑ کی دیکھ بھال کرنا۔۳- اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے مجاہدہ دریافت کرنا۔۴- ظاہری اعتبار سے زندگی کا نہایت معمولی درجہ، ایک عام آدمی کی سطح۔